سعدیہ بی بی
لیکچرار اردو، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج چک بیلی خان، راولپنڈی

فرخ سہیل گوئندی کے سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں تاریخی و سیاسی شعور

Abstract:

Literature mirrors the essence and values of life itself. Be it prose, verse, or rhyme, every form materializes the social and societal norms of that era. Farukh Sohail Gowind, being the travelogue writer, journalist, and social activist, blends history, religion, politics and culture together in his works. His travelogue *MEIN HUN JAHANGARD* is comprised of tourism of Iran, Turkey and Bulgharia. In his travelogue, we find a comparison of social and historical values of all these three countries within a shift of past and present timeframe. In this article, the study focuses on the exploration of historical and political agendas used by the author in *MEIN HUN JAHANGARD*.

Key Words: Farukh Sohail Gowind, *MEIN HUN JAHANGARD*, Bulgharia.

ادب زندگی کا عکاس ہے ادب کی خواہ کوئی بھی صنف ہو وہ زندگی کی قدروں کی ترجمان ہوتا ہے، جس طرح انسان اپنی تاریخ کے ساتھ جڑا ہے اسی طرح ادب بھی تاریخ کے ساتھ وابستہ ہے۔اس لیے ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے تاریخ کو اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ادیب اور شاعر بھی معاشرے کے فرد ہیں ان کا تعلق تاریخ سے گہرا ہے وہ انسانی معاشرت کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ تاریخ کا بھی مطالعہ کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ تاریخ کا بیان ادب کی ہر صنف میں ہوا ہے۔تاریخ کے ذریعے ہم ماضی میں جھانک سکتے ہیں اس انسانی زندگی کے جذبات، واقعات اور مشاہدات محفوظ ہوتے ہیں۔ادب کا سیاست کے ساتھ بھی گہرا رشتہ ہے کیونکہ ادب زندگی کے تمام امور کا احاطہ کرتا ہے اور سیاست زندگی کا حصہ ہے۔کلاسیکل ادوار اور جدید ادب کا مطالعہ کیا جائے تو ادب میں سیاست کے اثرات نظر آتے ہیں۔جس طرح تہذیب، تاریخ اور سیاست کا تعلق ادب سے جڑا ہوا ہے اسی طرح

سماج کا بھی ادب کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ہر ادیب کے ہاں سماج سے متعلق مواد ملتا ہے۔ اردو ادب کی خواہ کوئی بھی صنف ہو اس میں تاریخ، سیاست اور سماج کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ سفر نامہ اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ سفر نامہ نگار جب کسی خطے کا سفر اختیار کرتا ہے تو وہ وہاں کی تہذیب کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کی تاریخ، سیاست اور سماج میں بھی دلچسپی رکھتا ہے اور ان تاریخی، سیاسی اور سماجی عناصر کو اپنے سفر نامے میں بیان کرتا ہے۔ سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں تاریخی، سیاسی اور سماجی بیانیہ موجود ہے۔ مصنف نے سماجی اور سیاسی صورتحال کو بیان کیا ہے۔

فرخ سہیل گوئندی ایک ادیب، دانشور اور پولیٹیکل سوشل ایکٹوسٹ کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ وہ سیاسی سرگرمیوں میں خاصی دلچسپی رکھتے ہیں، اس کے علاوہ انھیں تاریخ سے گہرا لگاؤ ہے۔۔ ان کا سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد تین ممالک ایران، ترکی اور بلغاریہ کے سفر پر مشتمل ہے۔ سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں تہذیب کے ساتھ ساتھ تاریخ، سیاست اور سماج کو خاص طور پر موضوع بحث بنایا گیا ہے ان کے سفر نامے میں ان موضوعات کو بیان کیا گیا ہے۔ سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد اپنے اندر کئی موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس سفر نامے میں تاریخی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور تہذیبی موضوعات کے حوالے سے وسعت پائی جاتی ہے۔ موضوعات میں تنوع کے پیش نظر ان کے سفر نامے میں تاریخی اور سیاسی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔

ا۔ تاریخی عناصر:

تاریخ اور ادب کے درمیان تعلق واقعات کے بیان سے ہے، دونوں شعبوں کا تعلق بیانیہ تکنیک سے ہے۔ ادب میں واقعات کو بیان کرنے کے لیے تخیل اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جاتا ہے جب کہ تاریخ میں ماضی کے حقیقی واقعات کو بیان کیا جاتا ہے۔ تاریخ کو قوموں کی زندگی میں خاص اہمیت حاصل ہے۔

اس حوالے سے زاہد حسین میر لکھتے ہیں:

> تاریخ کو سمجھنے کے لیے پورے عہد، اس کے سماجی ڈھانچے اور سماجی ارتقا کو سمجھنا ضروری ہے۔ تاریخ میں فرد کی بھی اپنی ایک اہمیت ہے تاہم تاریخ کی تفسیر و تخلیق صرف افراد ہی نہیں کرتے۔ اس میں سماج کی اہمیت کا بھی خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ تاریخ پورے سماج کی ارتقا کی کہانی ہوتی ہے۔[1]

تاریخ کا تعلق ماضی سے ہے اور وہ اپنے عہد کی ترجمانی کرتی ہے۔ تاریخ کو ماہرین نے اس کی مختلف اقسام میں تقسیم کیا ہے جو تاریخ کے مطالعہ و تفہیم میں مددگار ثابت ہوئے ہیں، ان میں سوانحی تاریخ، سیاسی تاریخ، جنگی تاریخ وغیرہ اہم ہیں۔ ادب اور تاریخ کو الگ الگ شعبے ضرور ہیں لیکن اس کے باوجود تاریخ کا ادب کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ بعض اوقات ادب تاریخ کے ان گوشوں کی وضاحت کرتا ہے جو عام تاریخ سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ادب اور تاریخ کے آپس کے تعلق کی بنا پر ادبی تخلیقات میں تاریخی شعور کو بنیاد پایا جاتا ہے۔ تاریخ کے بارے میں جاننے کے لیے زمان و مکاں کی شرط لازمی ہے۔ کسی بھی عہد کی تاریخ کو اس کے زمانی و مکانی سیاق و سباق سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ادب میں تاریخی شعور سے مراد تاریخ کے واقعات کو سلسلہ وار بیان کر دینا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد معاشرے اور سماج کی حقیقتوں کو سمجھنا اور انھیں واضح کرنا ہے، ان حقیقتوں کو عام طور پر زمانی و مکانی تناظر میں بیان کرنا ہے۔ تخلیقات میں زمان و مکان کے حوالے سے آگہی تاریخی شعور کی اساس ہے۔ اس حوالے سے ''قراۃ العین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور'' میں خورشید انور کہتے ہیں کہ۔

> اول تو یہ کہ ادب میں تاریخی شعور کا مطلب یہ قطعی نہیں ہے کہ ادب میں پورے انسانی سماج کی یا مختلف ادوار کی سلسلے وار تاریخ بیان کی جائے، بلکہ ادب میں تاریخی شعور سے مراد مختلف سماجی حقیقتوں کی صحیح سمجھ اور ان حقیقتوں کا پر اثر اظہار ہے۔ یہ حقیقتیں اپنے زمان و مکاں کے اعتبار سے پیش کی جانی چاہیے اور زمان و مکان کا یہی شعور کافی حد تک تخلیقات میں تاریخی شعور کا تعین کرتا ہے۔ (۲)

فرخ سہیل گوئندی کا پسندیدہ موضوع تاریخ ہے۔ وہ تاریخ سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں مختلف ممالک کے سفر کے دوران جہاں اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں وہیں ساتھ ساتھ اس ملک کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کا ذکر تفصیلی کرتے ہیں۔ میں ہوں جہاں گرد تین ممالک کے سفر پر مشتمل سفر نامہ ہے جس میں فرخ صاحب نے ان تین ممالک کے سفر کا احوال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کی تاریخ کی کو بھی بیان کیا ہے۔ ان ممالک کی تاریخ کے بیان کرنے سے قاری کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان کے سفر نامے میں ایرانی تاریخ کو بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ تاریخ کو بڑے دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہیں اور قاری بڑی دلچسپی کے ساتھ سفر نامے کو پڑھتا جاتا ہے۔

ایران میں انقلاب سے قبل محمد رضا شاہ کی حکومت تھی۔ ۱۹۷۷ء میں شہنشاہ ایران کے خلاف عوامی تحریک پروان چڑھی اور اس تحریک کو ختم کرنے کی بہت زیادہ کوششیں کی گئی لیکن یہ تحریک دب نہ سکی اس

تحریک میں ایران کے مذہبی، اشتراکی اور ترقی پسند غرض ہر مکتب فکر کے لوگوں نے حصہ لیا۔ بالآخر اس تحریک کی بدولت ۱۹۷۷ء میں انقلاب برپا ہوا اور اس اسلامی انقلاب کی نمائندگی آیت اللہ خمینی کر رہے تھے۔

اس تاریخی انقلاب ایران کی وضاحت فرخ صاحب نے اپنے سفر نامے میں تفصیل سے کی ہے وہ لکھتے ہیں:

> اکتوبر ۱۹۷۷ء میں شہنشاہِ ایران کے خلاف عوامی تحریک نے جنم لیا۔۔۔ اگست ۱۹۷۸ء سے دسمبر ۱۹۷۸ء تک کے عرصہ میں عوامی تحریک انقلابی رنگ اختیار کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس عرصے میں شہنشاہِ ایران محمد رضا شاہ پہلوی کا تخت وتاج جھلنے لگا اور پورے ملک میں ایران کا پرچم لہرانے لگا۔ ۱۶ جنوری ۱۹۷۹ء کو شہنشاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی ملک سے نکلنے پر مجبور ہوا۔ ایران کے ہر شہر، قصبے اور دیہات میں گلی گلی مرگ برامریکہ، مرگ بر شاہ کے نعرے بلند تھے۔ یکم فروری ۱۹۷۹ء کو آیت اللہ روح اللہ خمینی اپنی چودہ سالہ جلاوطنی ختم کر کے ائیر فرانس کی ایک خصوصی پرواز ۴۷۲۱ کے ذریعے ۱۲۰ سے زائد عالمی صحافیوں کے ہمراہ واپس سرزمین وطن ایران لوٹے۔ (۳)

شاہ عباس اعظم صفوی سلطنت کا عظیم بادشاہ تھا اس کی پیدائش ۱۷ جنوری ۱۵۷۱ء کو ہوئی اور اس نے ۱۹ جنوری ۱۶۲۹ء کو وفات پائی۔ اس کے دور کو صفویہ خاندان کا عہدِ زریں کہا جاتا ہے۔ سترہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس کے دور حکومت میں ایران کے شمال مغربی حصے پر سلطنت عثمانیہ کا قبضہ تھا اور مشرق میں خراساں ازبک قابض تھے۔ اس نے بڑے تدبر اور دانشمندی سے کام لیتے ہوئے ساری صورتحال کو سنبھالا اور ترک عثمانیوں اور ازبکوں کو ایران سے باہر نکال دیا۔ شاہ عباس نے اپنے دور حکومت میں ایران کو غیروں سے چھڑانے کے ساتھ ساتھ دیگر بہت سے اصلاحات کیں مثلاً انھوں نے علم وادب کے شعبے میں کام کیا اور نئے شہروں اور بستیوں کی بنیاد بھی رکھی۔ اس کے دور میں فنون لطیفہ اور فن تعمیر کے شعبے نے بہت ترقی کی۔ اصفہان جو ایران کے وسط میں واقع ہے اس کو دارالحکومت بنایا گیا اور اسے اتنی ترقی دی گئی کہ اس شہر کو ''اصفہان نصف جہان'' کے نام سے پکارا جانے لگا۔

اسی تاریخی اہمیت کے حامل دور کو فرخ سہیل نے شاہ عباس کے کارناموں کو سفر نامہ میں اس طرح بیان کیا:

> اصفہان ۱۷۲۲ء۔۱۵۹۸ء تک ایران کا دارالحکومت رہا۔ اس شہر کو شاہ عباس اعظم نے ایرانی سلطنت کو دار لحکومت بنا کر چار چاند لگا دیئے۔ اس دور میں ایران اندرونی اور بیرونی طور پر خلفشار کا شکار تھا۔ ایران کے بڑے علاقے شہنشاہوں اور ازبکوں کے زیر آچکے تھے، اس نے ان خطوں کو منظم جنگوں کے ذریعے

واپس لیا۔ اس نے وسطی ایران میں ایران کا محفوظ دار الخلافہ بنایا یا ہی اس کے ساتھ علم و ادب، فن اور شاندار ایرانی تعمیرات کا گہوارہ اور نمونہ بناڈالا جو آج تک قائم ہے۔ (۴)

شاہ عباس صفوی سلطنت کا عظیم بادشاہ سمجھا جاتا ہے اس کو دورِ حیات ۱۵۷۱ء سے لے کر ۱۶۲۹ء تک کا ہے۔ اس کے عہدِ حکومت کو صفوی خاندان کا زریں دور سمجھا جاتا ہے۔ جب یہ تخت نشین ہوا تو اس وقت ایران کے مغربی حصوں پر ترک قابض تھے اور مشرق میں خراساں ازبکوں نے حکومت قائم کر رکھی تھی۔ شاہ عباس نے بڑی سوچ بچار سے کام لیتے ہوئے ان کا مقابلہ کیا اور صفوی سلطنت کو وسعت عطا کی۔ شاہ عباس نے جلفانو جو موجودہ آذر بائیجان کہلاتا ہے وہاں آرمینیائی بستی کی بنیاد رکھی۔ جس میں مختلف ادوار میں تغیر اور حالات کے جبر کی وجہ سے یہ آذر بائیجان میں شامل ہو گیا۔ اس پر بیرونی حملے ہوتے رہے اور ان کی نسل کشی کی جاتی رہی۔ آرمینیائی شہر کی تاریخ کو بیان کرتے ہوئے فرخ سہیل مزید لکھتے ہیں:

> شاہ عباس اعظم نے ۱۶۰۶ء میں "جلفانو" کی آرمینیائی بستی کی بنیاد رکھی ۔ اسے آرمینیائی Nakhchivan بھی کہتے ہیں۔ جلفا، آرمینیا کے ایک قدیم علاقے کا نام تھا، یہ بستی اسی مناسبت سے جلفانوی کہلائی، وہ خطہ اب آذر بائیجان میں ہے۔ Nakhchivan کوہ قاف میں آج کل آذر بائیجان میں ایک خود مختار ریپبلک ہے یہ پہلے آرمینیائی خطہ تھا۔ زمانے کے تغیرات اور جبر سے یہ آرمینیائی سے آذر بائیجانی خطہ Nakhchivan بن گیا۔ جلفانو میں آباد لوگوں کی اکثریت Nakhachivani لوگوں کی تھی جن میں مسیحی، مسلمان اور آرمینی یہودی بھی شامل تھے جو اس بستی میں لا آباد کیے گئے۔ آج بھی آرمینیوں کے نزدیک Nakhachivan ایک مقدس نام ہے۔ آرمینی مسیحیوں کے مطابق حضرت نوحؑ نے Nakhachivan کو آباد کیا ۔ ان کے نزدیک یہ Biblican خطہ ہے۔ (۶)

رے شہر ایران کا قدیم تاریخی شہر ہے، اس کو فیروزان یزدگرد نے آباد کیا۔ اس شہر میں شہر بانو اور شاہ عبدالعظیم کے علاوہ کئی عظیم پاکیزہ ہستیاں مدفن ہیں ۔ اس کی تاریخ پانچ ہزار سال سے قدیم بیان کی جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں اس شہر کا نام "رے" تھا۔ یہ شہر تہران کے ساتھ واقع تھا لیکن اب اس کی آبادی کے بڑھنے کی وجہ سے یہ تہران کا حصہ بن گیا ہے۔ اس شہر کی تاریخی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرخ سہیل گوئندی لکھتے ہیں۔

> رے شہر ایران کے قدیم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ قبل ازیں اسے راگا بھی کہا جاتا تھا۔ آرکیالوجی کے مطابق چھ ہزار سال پرانی ہے۔ اس علاقے میں پہلے ٹیلوں کی کھدائی سے پرانی تہذیبوں کے لاتعداد آثار

ملے ہیں۔ جب سکندر اعظم نے ایران فتح کیا تو اس کے جرنیل سیلوکس نے اس کا نام بدل کر مقدونیہ رکھ دیا۔ یہاں پر موجود تین ہزار سالہ قدیم قلعہ اپنے کھنڈرات کے باعث اس بستی کی قدامت کا منہ بولتا ثبوت ہے سلجوقیوں کے عہد میں یہ شہر گیارھویں سے تیرھویں صدی تک ان کا دار لحکومت رہا اور پھر منگولوں نے اس شہر کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔(۷)

کرد، کردستان سے تعلق رکھنے والے باشندے کہلاتے ہیں۔ ان لوگوں کی زیادہ تر بستیاں ایران، ترکی، عراق اور شام میں ہیں۔ یہ قوم تین سو سال قبل از مسیح سے ایران سے شام تک پھیلی ہوئی ہے۔ ساتویں صدی میں انھوں نے اسلام قبول کیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کا تعلق بھی اسی قوم سے تھا۔ کرد خانہ بدوشوں جیسی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا تو مشرق وسطیٰ میں کئی نئی آزاد ریاستیں وجود میں آئیں لیکن کرد آزاد مملکت حاصل کرنے سے محروم رہے۔ ۱۹۲۰ء کے سیورے معاہدہ کے تحت عراق، شام اور کویت کی مملکتیں آزاد ہوئیں اور تب کردوں سے آزاد ریاست کا عہد بھی کیا گیا لیکن مصطفیٰ کمال پاشا کے اقتدار سنبھالنے کے بعد ترکی کے ساتھ ساتھ ایران اور عراق کی حکومتوں نے بھی کردوں کی آزاد ریاست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کردوں کی آبادی کا سب سے زیادہ تناسب ترکی میں ہے یہاں ان کی آبادی ایک کروڑ اسی لاکھ کے قریب بتائی جاتی ہے۔ ۱۹۲۵ء میں کرد عوام نے شیخ سعید کی قیادت میں بغاوت کی جس کے سبب ترک حکومت نے کردوں کے خلاف سخت پالیسی اپناتے ہوئے ان کی زبان و ثقافت کو ختم کر کے پہاڑی ترک قرار دے کر انھیں ترک قوم میں ضم کرنے کی کوششیں شروع کر دی۔ ۱۹۷۸ء میں ترکی کے کردوں نے دوبارہ آزادی کی تحریک شروع کی جس کی وجہ سے ترک حکومت اور کردوں میں زبردست معرکہ آرائی ہوئی اور اس تحریک کی بدولت ترک حکومت کی معیشت کو دھچکا لگا اور تقریباً ۴۵۰ ارب ڈالر کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں کردوں کی تحریک کا تفصیلی احوال بیان کیا گیا، فرخ صاحب لکھتے ہیں۔

ترکی، ایران، عراق اور شام کی سرحدات کے درمیان دجلہ کے میٹھے پانیوں سے شروع ہو کر عراق کے تیل تک، کرد جہاں بھی موقع ملے اپنی علیحدگی کی تحریک کا سر اٹھاتے رہتے ہیں۔ وقت اور حالات کے مطابق یہ چاروں ممالک کسی نہ کسی ایک کرد تحریک کی پشت پناہی بھی کرتے ہیں۔۔۔۔ امریکہ، سوویت یونین اور اب روس اپنے علاقائی مفادات کے لیے کسی نہ کسی علیحدگی پسند کرد تحریک کی پشت پر رہتے ہیں۔ ایران کے اکتیس صوبوں میں ایک کردستان کے نام سے موجود ہے۔ ترکی میں رہنے والے کرد ان چار ممالک میں بسنے والے کردوں کا ۴۸ فیصد اور ترکی کے اندر کردوں کی آبادی کا تناسب ۲۰ سے ۲۵ فیصد تک ہے۔ بدبخت کردوں کے پاس خطے کے ان چار علاقائی طاقتوں اور عالمی طاقتوں کا مہرہ بننے کے سوا کوئی

چارہ نہیں۔۔۔ترکی میں تیسرا مارشل لاء لگا اس دوران انقرہ کی طلبا سیاست میں قدم نکالنے والے عبداللہ اوجلان نے ترکی کے اندر کردوں کی علیحدگی کی تحریک کو تیز کر دیا۔اس کرد تحریک کو شام لبنان کے اندر مسلح تربیت دی اور سوویت یونین اس کرد تحریک کا اہم سرپرست تھا۔(۸)

ارض روم کا قدیم نام کیرن تھا پھر بازنطینی عہد میں یہ شہر تھیوڈوپولس کے نام سے جانا جاتا تھا۔اس کا موجودہ نام جنگ ملاز کرد میں فتح کے بعد مسلمانوں نے دیا۔یہ شہر مختلف ادوار میں مختلف جنگوں کا شکار بنتا رہا اور مختلف قومیں اس پر قبضہ کرتی رہیں۔۱۸۲۹ء میں اس شہر پر روس نے قبضہ کیا لیکن معاہدہ ادرنہ (Treaty of Arainople) کے تحت یہ شہر دوبارہ عثمانیوں کے قبضے میں آگیا۔۱۸۷۷ء میں روس نے ایک بار پھر اس شہر پر حملہ کیا اور اس دوران شہریوں نے اس حملے کے خلاف مزاحمت کی لیکن روسی افواج اس اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں تاہم معاہدہ سان اسٹیفنو کے تحت دوبارہ سلطنت عثمانیہ کو مل گیا۔۱۹۱۵ء میں یہ شہر آرمینیائی باشندوں کے قتل عام اور ان پر مظالم کے لیے اہم مرکز رہا۔۱۹۱۶ء میں یہ شہر تیسری مرتبہ پھر روسی افواج کے قبضے میں آگیا اور ۱۹۱۸ء میں معاہدہ بریسٹ—لیٹوفسک کے تحت پھر سلطنت عثمانیہ کے حوالے کر دیا گیا۔۱۹۱۹ء میں ارض روم کانگریس جو ترک جنگ آزادی کا آغاز سمجھی جاتی ہے۔ترک جنگ آزادی ایک تحریک تھی جو پہلی جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ کی شکست کے بعد ترک قوم نے شروع کی اس کی ابتدا ۱۹ مئی ۱۹۱۹ء میں ہوئی اور اختتام ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء کو ہوا۔فرخ سہیل گوئندی صاحب نے اس شہر کی تاریخ کو گہرے مشاہدے کے ساتھ اپنے سفر نامے میں ہوں جہاں گرد میں بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

وہ ترکی کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

ارض روم میں ۲۳ جولائی ۱۹۱۹ء سے ۴ اگست ۱۹۱۹ء یعنی تیرہ دن ۵۶ بہادر ترک سپوت اکٹھے ہو کر اپنی قوم کے متعلق فیصلہ نہ کرتے تو ترکی آج کچھ یونان، کچھ شام، عراق، بلغاریہ، روس، آرمینیا اور نہ جانے کس کس حصے میں بٹا ہوتا۔آیا صوفیہ اور نیلی مسجد آج یونانی گرجا ہوتے۔اور ہم سیاح لوگ قرطبہ کی مشہورِ زمانہ ہسپانوی مسجد کی طرح، نیلی مسجد استنبول کے سامنے تصویر بناتے کہ کبھی یہ مسجد بھی آباد ہوا کرتی تھی ۔استنبول کے لیے یونان کا ویزا لیتے اور ارض روم کے لیے روس یا آرمینیا کا ویزا درکار ہوتا۔۔۔ارض روم کانگریس ۲۳ جولائی ۱۹۱۴ء تا ۴ اگست ۱۹۱۹۴ منعقد ہوئی جس نے ترکوں کو ایک نئے جنم کے فیصلے پر اکٹھا کیا۔(۹)

علاؤالدین کیقباد بن کیکاوس سلجوق سلطنت کا حکمران تھا۔ اس کا دور حکومت ۱۲۲۰ء سے ۱۲۳۷ء کے عرصہ پر محیط ہے۔ یہ سلجوقیہ سلطنت کا آخری بااثر حکمران تھا۔ اس کے دور میں بہت سے اہم معرکے سر کیے گئے ، عثمانیہ سلطنت کے بانی ارطغرل غازی نے اسی کے عہد میں بازنطین کے بہت سے علاقوں پر فتح حاصل کی اور کئی قلعوں پر سلجوق سلطنت کے پرچم لہرائے۔ علاؤالدین کے دور میں بہت سے تعمیراتی کام بھی کیے گئے ان میں اناطولیہ میں پہلی مسجد کی تعمیر کی گئی جو آج بھی اناطولیہ میں واقع ہے اس کی تاریخ پر فرخ سہیل یوں نظر ڈالتے ہیں۔

> سلطان علاؤالدین جامع ۔ معروف سلجوقی سلطان علاؤالدین کیقباد (۱۲۳۷ء-۱۲۲۰ء) کے نام سے اس قدیم ترین مسجد کی تعمیر ۱۲۲۰ء میں سلطان عزیزالدین کیکاؤس اول نے کروائی۔ میں نے اس حوالے سے مزید تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ سلطان علاؤالدین جامع در حقیقت ۱۱۷۸ء میں ایک چھوٹی سی مسجد کے نام پر تعمیر ہو گئی تھی، مگر تکمیل علاؤالدین کیقباد کے دور میں ہوئی۔ مسجد کے اندر لکڑی کا خاصا کام ہوا ہے اس کا باہر والا حصہ منہدم ہو چکا ہے عثمانی دور میں اس میں توسیع ہوئی۔ بنیادی طور پر علاؤالدین جامع، سلجوقی فن تعمیر کا ایک اولین شہ پارہ ہے۔ لکڑی کا منبر جو سلجوقی دور میں بنا ابھی تک زیرِ استعمال ہے۔ لکڑی کے منبر کے علاوہ بھی مسجد میں لکڑی پر کندہ کری ابھی تک برقرار ہے۔ ۱۹۵۴ء میں علاؤالدین جامع کو ترک حکومت نے خصوصی توجہ دے کر مرمت کروایا۔ (۱۰)

فرخ سہیل صاحب نے اس ورثے کی جزئیات کے بیان اس کی مکمل تاریخ، اس کی تعمیر کے مراحل کو جس طرح بیان کیا ہے وہ قابل ذکر ہے۔ مصطفیٰ کمال پاشا، جنگ عظیم اول میں عثمانی فوج کے سالار اور جدید ترکی کے بانی اور پہلے صدر تھے۔ خلیفہ عبدالحمید کے دور حکومت میں ان کے خلاف مختلف سرگرمیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے کچھ عرصہ قید رہے اور رہائی کے بعد فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ جنگ اطالیہ اور جنگ بلقان میں اپنی خدامت سرانجام دیں۔

> جنگ سقاریہ ۲۳ اگست ۱۹۲۱ء سے ۱۳ ستمبر ۱۹۲۱ء تک اکیس دنوں میں ترکوں نے جنگ میں جو فتح حاصل کی، وہ ترکوں کی آزادی کی امید تھا۔ یونانی اس سارے خطے میں بشمول استنبول پر جہاں ان کی سب سے یادگار آیا صوفیہ تھی، اپنی قدیم یونانی سلطنت کی بحالی کا دعویٰ کر کے استنبول کے گرداگرد دھاوا بول چکے تھے۔ اس موقع پر ترکوں کے سپہ سالار مصطفیٰ کمال پاشا نے کہا، ''ہمارے پاس دشمن کے خلاف لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں، سوائے اس کے کہ وہ ہمیں نیست و نابود کر دیں اور ہم بحیرہ مار مرا میں ڈوب مریں یا ہم انھیں شکست فاش سے دوچار کر کے ان کے گھناؤنے خواب کو بحیرہ مار مرا میں ڈبو دیں۔ (۱۱)

اس سفر نامے میں ترکوں کی جدوجہد اور تاریخی کرداروں کا تذکرہ ایسے کیا گیا ہے کہ قاری اس کی تاریخی اہمیت سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ ترکوں کی نفسیات سے واقف ہوتا ہے آزادی کے لیے ان کی جدوجہد کردار اور رویوں سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔

ترکی زبان کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ عثمانیوں کے دور حکومت میں فارسی اور عربی زبان کو بہت زیادہ فوقیت دی جاتی تھی اور ترکی زبان کو نظر انداز کر دیا جاتا۔ اس دور میں جو لوگ ترک زبان بولتے تھے انھیں جاہل سمجھا جاتا تھا۔ سلطنت عثمانیہ کے دور حکومت میں ترکی زبان کو عربی رسم الخط میں لکھا جاتا اور اس زبان کو عثمانی ترکی زبان کہا جاتا۔ ۱۹۲۳ء میں جب جدید ترکی کا قیام عمل میں آیا تو ترک قوم نے اپنی زبان کی حفاظت کے لیے اپنی زبان کے حق میں آواز بلند کی اور ۱۹۲۸ء میں مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک کی کوششوں سے ترکی زبان میں اصلاحات کی گئیں اور عربی رسم الخط کو ختم کر کے لاطینی رسم الخط کو رائج کیا گیا اور عثمانی حروف تہجی کو ترکی حروف تہجی میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس تاریخی واقعہ کو فرخ سہیل نے اس طرح بیان کی ہے کہ اس سے ترکوں میں اپنی زبان کے احیا کے لیے پائی جانے والی تڑپ اور لگن واضح ہوتی ہے۔ زبان جو قومی شناخت اور تاریخ کے تحفظ کا اہم ذریعہ ہوتی ہے اس کے لیے ترکوں کی کوشش کا ذکر یوں کیا ہے۔

> ترک قوم کی شناخت میں ان فکری تحریکوں کا اہم ترین نکتہ اپنی ترکی زبان کی بحالی تھا۔ عثمانی اشرافیہ کی زبان بری طرح Persiaanate (فارسی اثر کے تحت) ہو چکی تھی۔ اس عثمانی اشرافیہ کی زبان ''عثمانلی'' کو برتری حاصل تھی اور ترک زبان کا جاہل اور اناطولیہ کے گنواروں کی زبان سمجھا جاتا تھا۔ اتاترک کی پیدائش سے دہایوں قبل ترک زبان کی بحالی کی تحریک، ترک دانشوروں کی قوم پرستی کا ایک اہم نکتہ تھا۔۔۔۔ ۱۹۲۶ء میں جب سابق سوویت یونین میں شامل ترک اقوام نے باکو کانگریس میں لاطینی حروف تہجی اختیار کر لیے تو اب اتاترک کے پاس سیاسی جواز تھا کہ ترکوں کو ایک ربط میں باہم پیوست کیا جائے۔۔۔۔ یوں نومبر ۱۹۲۸ء میں ترکی کی اسمبلی نے رسم الخط کا نیا قانون منظور کیا اور ترک زبان کی تلاش کا سفر شروع کیا۔ (۱۲)

گرینڈ نیشنل اسمبلی ۱۹۲۰ء میں مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک نے قائم کی۔ گرینڈ نیشنل اسمبلی کی تشکیل کو حکومتی نظام کا سب سے اہم جزو سمجھا جاتا ہے۔ یہ اسمبلی ترکی کی سیاسی و ثقافتی اداروں کی نمائندگی کرتی ہے۔ مارچ ۱۹۲۰ء میں اس کے لیے تحریک چلی اور انقرہ شہر میں اس کو تشکیل دینے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں پورے ملک کے مختلف علاقوں اور جماعتوں کے نمائندوں نے اس میں شرکت کی۔ اس اسمبلی کا مقصد ترکی کی

سیاسی وحدت کو مستحکم کرنے کے ساتھ ساتھ ترکی کے آئین اور قومی استقلال کے لیے ایک حکومتی نظام کو تشکیل دینا تھا۔ گرینڈ نیشنل نے ۱۹۲۳ء میں ترکی کے آئین کی تصدیق کی اور اس کے بعد سلطان محمد کی سلطنت کا ختم کر کے اتاترک کی حکومت کو تشکیل دیا۔ ترکی میں جمہوری نظام قائم کیا گیا اور اتاترک کی حکومت کا آغاز ہوا۔ یہ تبدیلی ترکوں کی تاریخ کا ایک اہم موڑ ثابت ہوئی تمام شعبہ ہائے زندگی اس سے متاثر ہوئے ایک نئے دور کا آغاز ہوا اس نے ترکی کو اقوام عالم میں ایک نئی شناخت دی۔ مصنف نے سیاحت کے دوران گرینڈ نیشنل اسمبلی کا دورہ کیا اور اس کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ۲۰ اپریل ۱۹۲۰ء کو اتاترک نے یہاں گرینڈ نیشنل اسمبلی قائم کی۔ انگورہ یوں فوجی مزاحمت اور جنگ آزادی اور نئی شناخت کی امید بنا۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو مکمل کے بعد انگورہ کو ترکیہ جمہوریہ کا دار لحکومت قرار دیا۔ زوال کی راکھ سے نئی مملکت کا قیام۔ قدیم یونان مین اسے Anchor بھی کہا جاتا رہا ہے۔ جی وہی جس سے بحری جہاز سفر کے بعد لنگر انداز ہوتا ہے۔ یہ ایک ہی لفظ ہے۔ انقرہ اس نئی مملکت کا Anchor (لنگر) بنا۔ بیڑا پار ہونے کے بعد مملکت جمہوریہ ترکیہ یہاں لنگر انداز ہوئی جسے یورپ کے ترقی یافتہ ممالک "یورپ کا مردِ بیمار کہتے تھے۔ مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک نے اس مردِ بیمار کو ایک نئی زندگی ہی عطا نہیں کی بلکہ توانا، کامیاب اور طویل زندگی عطا کر دی۔ (۱۳)

مصنف کا تاریخی شعور اس سفر نامے میں ہمیں عمارات سے معلومات بھی فراہم کرتا ہے۔ آیا صوفیہ کا شمار ترکی کی قدیم اور شاہکار تعمیرات میں ہوتا ہے۔ اس کی تعمیر تقریباً پانچویں صدی کی چوتھی دہائی میں ہوئی۔ ترکی میں مختلف ادوار مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے حکومت کرتے رہے۔ اسی وجہ سے آیا صوفیہ کی حیثیت بھی اسی مناسبت سے اہمیت کی حامل رہی۔ اس عمارت کا استعمال کبھی مسجد کے طور پر کیا گیا تو کبھی کلیسا بنا دیا گیا۔ فرخ سہیل نے دوران سفر جن مقامات کی سیر کی وہاں کا احوال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان مقامات کی مکمل تاریخ بھی بیان کی ہے۔

آیا صوفیہ کی تاریخ کا تفصیلی ذکر انھوں نے اپنے سفر نامے میں کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

> آیا صوفیہ کے عالمی شہرت یافتہ کیتھڈرل کی تعمیر کا آغاز ۵۳۲ء میں ہوا جس کی تکمیل پانچ سال میں ۵۳۷ء میں ہوئی۔ کانسٹنٹائن اعظم نے جب قسطنطیہ کو مشرقی رومن ایمپائر کا دار لحکومت قرار دیا تو یہی شہر مشرقی آرتھوڈوکس مسیحیت کا مرکز بنا۔ قسطنطنیہ، مشرقی آرتھوڈوکس (یونانی آرتھوڈوکس) چرچ کی سیٹ قرار دے دیا گیا جسے Ecumenical Patriarchate of Constantinople کہا جاتا ہے۔ نیو روم Nova Roma کا کیتھڈرل جو ۳۳۰ء میں کانسٹنٹائن اعظم نے یہاں منتقل کیا تھا۔

یونانی اور رومن زبان میں ہاگیا صوفیہ، لاطینی میں سانتا صوفیہ یعنی ''مقدس تدبر'' بازنطینی بادشاہ جسٹینین اعظم کے حکم سے تعمیر ہوا۔ بازنطینی بادشاہ نے اپنے وقت کے دو عظیم معماروں Isodore of Miletus اور Anthemius of Tralles کو حکم دیا کہ مجھے مشرقی روم ایمپائر کا عظیم الشان کیتھڈرل بنانا ہے جس کا گنبد ہمارے مذہب، ہماری سلطنت اور قسطنطیہ کی عظمت اشہرہ آفاق ثبوت بنے۔۔۔ڈیڑھ ہزار سال قبل تعمیر ہونے والا آیا صوفیہ کے گنبد اور اس کی عمارت کا جلال اس کے اندر کھڑے ہو کر آج بھی محسوس ہو رہا تھا۔ (۱۴)

مصنف نے حقائق کی کھوج اور تاریخ کے اوراق سے اس قوم کی زندگی کے مختلف تغیرات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

سلطنت عثمانیہ کا دور حکومت ۱۵۱۷ء سے لے کر ۱۹۲۴ء کے عرصے پر محیط ہے۔ سلطنت عثمانیہ تاریخ کا ایک اہم اور دلچسپ موضوع ہے۔ سلطنت عثمانیہ کے پہلے فرمانروا عثمان خان کا خاندان ایشیائے کوچک میں خانہ بدوش کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ انھوں نے سلجوقی سلطنت کی بنیاد رکھتے ہوئے مشرق وسطیٰ، افریقہ اور اناطولیہ پر حکومت کی، اس کے بعد عثمان خان نے سلطنت عثمانیہ کی بنیاد رکھی جو آٹھ سو سال تک قائم رہی۔ عثمانی حکومت نے رومیوں اور بازنطینوں کو شکست دے کر نئی ترک تہذیب کی بنیاد رکھی۔ عثمانیوں نے تین براعظموں پر اپنا پرچم بلند کیا۔ سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ فرخ سہیل گوئندی صاحب کا مطالعہ وسیع ہے اور وہ تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ترکی کے ذکر کے ساتھ سلطنت عثمانیہ کا تعارف لازم ہوتا ہے۔ انھوں نے بھی اپنے سفر نامے میں عثمانی سلطنت کی تاریخ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

۲۳ مارچ ۱۴۵۳ء کو عثمانی دارالحکومت ایدرنے سے ساتویں سلطان محمد دوئم نے اپنی جنگی مہم کا آغاز شاہی توپ خانے کی روانگی کی تقریب سے کیا اسّی ہزار عثمانی فوج جس میں پہلی مرتبہ کسی ریاست نے منظم انفینٹری کو متعارف کروایا، جو کہ مسیحوں پر مشتمل تھی، اس کے بعد نوجوان پیادوں کی فوج جو عرب عارضی سپاہیوں پر مشتمل تھی، جسے عثمانی ''عزب'' کہتے تھے۔ یہ کنوارے عرب (رنگروٹ) نوجوان دیہات سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ (۱۵)

سٹالن گراڈ جس کا موجودہ نام وولگو گراد ہے اس شہر میں ایک عظیم معرکہ ہوا جو معرکہ سٹالن گراد کے نام سے جانا جاتا ہے اسے جنگ عظیم دوم کا سب سے اہم موڑ سمجھا جاتا ہے جس میں تاریخ کی سب سے زیادہ انسانی جانوں کا نقصان ہوا۔ اس معرکے میں نازی جرمنی نے اس شہر کا معاصرہ کیا اور سوویت اتحاد نے جوابی حملہ کیا جس کے نتیجے

میں تقریباً ۲۰ لاکھ ہلاکتیں ہوئیں، اس کے علاوہ مالی نقصان بھی دونوں کو برداشت کرنا پڑا۔ اس جنگ میں سوویت اتحاد کو فتح نصیب ہوئی۔ فرخ سہیل صاحب لکھتے ہیں کہ جب وہ کسی مقام کی سیر کرتے ہیں تو اس شہر کی پوری تاریخ ان کے ذہن میں گھوم جاتی ہے اور جب لکھنا شروع کرتے ہیں تو روانی کے ساتھ لکھتے ہی جاتے ہیں۔

سٹالن گراڈ شہر کی تاریخ پر یوں نظر ڈالتے ہیں:

> بلقان ایکسپریس جب سولن گراڈ پر کی تو ''گراڈ'' لفظ نے میرے دماغ میں موجود معلومات اور خیالات میں مزید اودھم مچادی۔ سوویت یونین کے اس شہر کا نام ایسا ہی ہے، ''سٹالن گراڈ'' جہاں ہٹلر کے فاشزم کے خلاف دوسری جنگ عظیم میں سٹالن کی سوویت افواج نے جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر حتمی جنگ لڑی۔ "Battle of Stanlingrad"۔ ۲۳ اگست ۱۹۴۲ء سے ۲ فروری ۱۹۴۳ء تک سٹالن گراڈ کا شہر دوسری عالمی جنگ کا فیصلہ کن میدان جنگ بن گیا۔ اس کی گلیوں، محلوں، چوکوں، بازاروں، مضافات میں اشتراکی روس کی افواج نے جرمن افواج کو ناکوں چنے چبوادیئے۔ یہی وہ شہر تھا جس نے عالمی جنگ کا پانسا پلٹ دیا۔ کہتے ہیں کہ یہاں جنگ House to House ہوئی یعنی ہر گھر میدان جنگ تھا۔ ''جنگ سٹالن گراڈ'' میں بیس لاکھ لوگ جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور یہیں سے جرمنی کی پسپائی کا آغاز ہوا۔
>
> ''سٹالن گراڈ'' کا اس جنگ سے پہلے نام والگو گراڈ تھا۔ اس جنگ میں سوویت یونین کی فتح کے بعد ہی اس کا نام ''سٹالن گراڈ'' رکھا گیا۔ جب سویت یونین میں سٹالن کا دور ختم ہوا تو نکتیا خروشیف کے دور میں ۱۹۶۱ء میں دوبارہ اس کا پرانا نام والگو گراڈ بحال کر دیا گیا۔ (۱۶)

اس سفر نامے میں بلغاریہ کے سفر کا احوال بھی شامل ہے۔ مصنف نے تاریخ کے بیان میں اس بات کو مد نظر رکھا ہے کہ محض افسانوی رنگ نہ اپنایا جائے بلکہ اعداد و شمار، سنین اور حقائق کے بیان میں احتیاط کو بھی مدِ نظر رکھا ہے۔ بلغاریہ کا سرکاری نام جمہوریہ بلغاریہ ہے یہ جنوب مشرقی یورپ میں واقع ہے۔ اس کی سرحدیں پانچ ممالک سے ملتی ہیں شمال میں دریائے ڈینیوب کے ساتھ رومانیہ، مغرب میں سربیا اور مقدونیہ، جنوب میں ترکی اور یونان واقع ہیں۔ بلغاریہ کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ بلغاریہ قوم کی تاریخ پر فرخ سہیل نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> بلغار قوم کا اصل یا اور یجن کے بارے میں مختلف آرا ہیں بلغار قوم کو انگریزی میں Bulgarian کہا جاتا ہے۔ اردو میں بلغار، جبکہ خود ان کی اپنی زبان میں ''بلگار''۔ زیادہ تر مؤرخین اور ماہرین بشریات کی تحقیق ہے کہ وسطی ایشیا کے خانہ بدوش ہیں۔ تقریباً دو ہزار سال پہلے بلقان میں آکر آباد ہوئے جہاں رومنوں کے تحت دیگر قومیں آباد تھیں اور یہاں انھوں نے تھریس، قدیم یونانی، بازنطینی تہذیب و تمدن کے ملے جلے

اثرات اندر جذب کیے۔ تھریس کی سرزمین اور بلقان میں بلغار قوم کی نسلیاتی تشکیل ہوئی۔۔۔۔ بلغاروں کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے اور اپنے تاریخی فخر کے حوالے سے ان کا یورپ کی تاریخ میں اہم مقام ہے۔ بلغار اپنے ''ہن'' ہونے پر فخر کرتے ہیں جن کا ثبوت ان کی اولین تاریخی دستاویزات سے ملتا ہے۔۔۔(۱۷)

تاریخ ماضی کے واقعات پر مشتمل ہے جبکہ ادب میں ماضی کے واقعات کو فطرت کے مطابق فنکارنہ انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ سفر نامہ میں ہونجہاں گرد کا مطالعہ کے دوران یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فرخ صاحب نے بڑی مہارت کے ساتھ ادب تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخی واقعات کو بیان کیا ہے۔ ان کے سفر نامے میں ہمیں تاریخ کی مختلف اقسام جیسے ، جنگی تاریخ ، سوانحی تاریخ اور مذہبی تاریخ وغیرہ کی صورتیں ملتی ہیں۔ انھوں نے جن ممالک کی سیر کی ان ممالک کی تاریخ اور وہاں موجود قدیم عمارتوں کی تاریخ بیان کی ہے۔

سیاسی عناصر:

سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں سیاسی عناصر کا جائزہ لینے سے قبل ضروری ہے کہ اس بات کو سمجھا جائے کہ سیاست کیا ہے؟ ادب اور سیاست کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ اور اس کی کیا اہمیت ہے؟ سیاست کا مفہوم عام طور پر نظام حکومت کو چلانے کا فن سمجھا جاتا ہے۔ سیاست عربی زبان کا لفظ ہے اور یہ بطور اسم مونث مستعمل ہے۔ عام طور پر اس کے معنی کسی ملک کا نظام حکومت، ملکی تدبیر وانتظام، طریقہ حکمرانی وغیرہ لیے جاتے ہیں۔

قومی انگریزی لغت میں سیاست کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

سیاست سے مراد حکومت کاری کا علم، کسی حکومت، قوم یا کسی مملکت کی حکمت عملیاں اور مقاصد، سیاسی جماعتوں کے طور طریقے اور ان کے مقابلے، سیاسی معاملات، کسی شخص کے سیاسی روابط یا عقائد، ان لوگوں کی ریشہ دوانیاں یا منصوبہ بندیاں جو ذاتی طاقت، شان و شوکت، منصب یا اس قسم کے دیگر مقاصد کے جویا ہوں۔(۲۰)

سیاست وہ عمل ہے جس کے ذریعے مختلف افراد تدبر کے ساتھ ملکی یا علاقائی سطح پر حکومت یا انتظام چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سیاست عموماً انتظامی تنظیمات، سیاسی جماعتوں اور حکومتی اداروں کے ذریعے ملکی انتظام، قوانین اور نظم و نسق کو جاری رکھنے کوشش کرتی ہے۔ سیاست کے ذریعے، حکومتی اداروں، سیاسی جماعتوں اور سیاست دونوں کو عوام کی توقعات اور ان کے مسائل کو سمجھنے اور انھیں حل کرنے ذمہ دار بنایا جاتا ہے۔

سیاست کی وضاحت کرتے ہوئے جان ایچ ہال ول لکھتا ہے:

سیاسی نظریہ اور سیاسی فلسفہ انسان اور انسانی معاشرے کے لیے خیر اور صلح کے نظام کے اصولوں کے مطالعے سے عبارت ہے۔ انسان محض زندہ رہنے کے لیے زندہ نہیں رہتا بلکہ اچھی زندگی بسر کرنے کا بھی خواہاں ہوتا ہے۔ یہ اس کی فطرت کا تقاضا بھی ہے اور یہی فطرت کا خاصہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے وجود اور اپنے اعمال کا جواز تلاش کرتا ہے انسان نہ صرف اس کا شعور رکھتا ہے کہ وہ کیا ہے بلکہ اس کا کیا ہونا چاہیے اور کیا ہو سکتا ہے۔ اخلاقیات کے ذریعہ عقلی طور پر اس خیر کی ماہیت کو متعین کرنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جس کا وہ طلب گار ہے۔ سیاسیات میں وہ اسی خیر کو سماجی زندگی میں روبہ عمل لانا چاہتا ہے خواہ اس کوشش میں اپنے آپ کو یا دوسرے کے ہاتھوں کتنی ہی ناکامیوں کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس خیر کو روبہ عمل لانے میں مدد دینا فلسفہ سیاست کا اہم ترین مقصد ہے۔[۲۱]

سیاست کا مقصد معاشرے میں مساوات اور نظام عدل قائم کرنا اور اس کے مطابق اصول و ضوابط متعین کرنا ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف ماہرین نے سیاست کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں اور اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ ان تصورات اور نظریات کو عام طور پر سیاسی فکر کا نام دیا جاتا ہے۔ ان سیاسی افکار و نظریات میں فرق کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ماحول، حالات اور ادوار کے حساب سے جنم لیتے ہیں۔ ادب اپنے معاشرے کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ انسانی زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور عوامل چاہے وہ مذہبی ہوں یا سماجی، تہذیبی ہوں یا سیاسی وہ تمام ادب میں پیش کیے جاتے ہیں۔ ادیب عام انسان کی نسبت زیادہ حساس ہوتے ہیں وہ اپنے ارد گرد جو کچھ دیکھتے ہیں اس کو محسوس کرتے ہیں اور ان کو الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں۔ بعض ادیب جو سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کی تخلیقات کا جائزہ لیا جائے تو ان پر سیاست کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ادب اور سیاست کے باہمی تعلق کے حوالے سے مشرف احمد راجندر سنگھ بیدی کا تنقیدی مطالعہ میں لکھتے ہیں۔ ''ادب سیاست سے الگ نہیں رہ سکتا۔ یہ ایک پامال مضمون ہے اور یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے سیاست سے۔''[۲۲] سیاست کے اثرات آج کل انسانی زندگی میں نمایاں ہیں اور تمام نظام زندگی سیاست کے تابع نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے ادیب پر بھی سیاسی نظام کے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور ان تاثرات و خیالات کو اپنی تخلیقات میں منتقل کر دیتا ہے۔

ہر ریاست کا اپنا نظام زندگی ہے اور اسی کے مطابق اس کے سیاسی و سماجی حالات ہیں۔ کسی بھی ادب کے مطالعہ کے دوران یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس ملک کے سیاسی و سماجی حالات ادب میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ قمر رئیس اور عاشور کاظمی کے الفاظ میں ''سیاست ہر جگہ ہے، ہر طرف ہے فن اور ادب کی تخلیق میں ہے۔''[۲۳] ادب کا اپنے ملک کی سیاست سے تاثر ہونا فطری بات ہے لیکن ادیب کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ جو ادب وہ

تخلیق کرے اس کا مقصد لوگوں میں سیاسی شعور کی بیداری ہونا چاہیے نہ کہ اسے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جائے۔ فرخ سہیل گوئندی سفر نامہ نگار، مصنف، صحافی، تجزیہ نگار اور سوشل ایکٹوسٹ کے طور پر جانے جاتے ہیں اس کے علاوہ سیاست اور تاریخ سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں، وہ نوجوانی ہی میں سیاست میں دلچسپی لینے لگے اور پاکستان میں جمہوریت کی بحالی اور سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے لگے۔ وہ نہ صرف اپنے ملک کی سیاست میں دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے ممالک کی سیاست اور تاریخ میں بھی گہری دلچسپی لیتے ہیں اور بین الاقوامی سطح پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کا سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات ،احساسات وجذبات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان تین ممالک (ایران، ترکی اور بلغاریہ) کی سیاست اور تاریخ کو بھی نہایت عمدہ انداز سے بیان کرتے ہیں۔

انقلاب ایران تاریخ ایران کا اہم موڑ ثابت ہونے کے ساتھ ایک اہم سیاسی باب بھی ہے جس نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا اور ایران کو نیا تشخص عطا کیا۔ فرخ سہیل دوران سفر جہاں تہران کی یونیورسٹی کی تاریخ سے آگاہ کرتے ہیں وہیں اس پر سیاست کے اثرات کا ذکر بھی کرتے ہیں:

> امام خمینی نے انقلاب کے بعد ایران کی ریاست کو اسلامیانے کا جو عمل شروع کیا، اس میں تعلیمی ادارے سرفہرست تھے۔ مساجد کو سیاسی مراکز قرار دیا گیا۔ جہاں نمازِ جمعہ کے وقت امام سیاسی خطبے دیتے ہیں۔ ملکی اور عالمی سیاست پر تفصیل بیان کرتے ہیں۔ چونکہ رہبر انقلاب کی نظر میں سیاست اور مذہب کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اس لیے اس اسلامیانے کے عمل میں دانش گاہِ تہران سب سے زیادہ اسلامائزیشن کا نشانہ بنی۔ اور یہ یونیورسٹی درحقیقت ترقی پسندوں، کیمونسٹوں اور روشن خیال قوم پرستوں کا گڑھ تھی اور یہی لوگ انقلاب کا پہلا قطرہ بنے۔ (۲۴)

فرخ سہیل گوئندی نے جب ایران کا سفر کیا اس وقت وہاں انقلاب ایران برپا تھا، تب وہاں کے لوگ دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے ایک انقلاب ایران کے نعرے بلند کر رہے تھے اور دوسرے اس کی مخالفت اور امریکہ کی چال کہہ رہے تھے۔ انقلاب ایران ۱۹۷۹ء میں ہوا اور فرخ صاحب نے ۱۹۸۳ء میں وہاں کا سفر اختیار کیا۔ اس وقت انقلاب ایران کے اثرات بالکل نمایاں تھے اور ہر طرف یہی موضوعِ گفتگو تھا۔ دوران سفر فرخ صاحب مختلف لوگوں سے ملے جن سے ان ممالک کی تہذیب، سماج اور سیاست پر گفتگو ہوتی رہی۔ اسی دوران ان کی ملاقات ایک ایرانی خاتون سے ہوئی جن سے سیاست پر بحث ہو گئی اس دور میں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی اور فرخ صاحب ذوالفقار علی بھٹو کے حمایتی تھے اور انھوں نے ذوالفقار علی بھٹو کے لیے اپنی آواز بلند کی۔ گوئندی

صاحب کے بقول وہ خاتون بھی ذوالفقار علی بھٹو کی مداح نکلیں اور اس دوران جو ان کی گفتگو ہوئی اُس میں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''اوہ! تم لوگوں نے اتنے بڑے لیڈر کو اپنے ہاتھوں سے مار دیا۔''

اب اس کا لہجہ بدل چکا تھا، وہ اب بے تکلف نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ وہ بولے جا رہی تھی۔

''تم لوگوں نے امریکہ کی سرپرستی میں اسے قتل کر دیا۔۔۔ اور وہ جنرل ضیا، سگِ امریکہ۔۔۔''اس نے کہا، ''جس روز ذوالفقار علی بھٹو کو تم لوگوں نے پھانسی پر چڑھایا، اس روز میرے بابا نے سینہ پر ہاتھ مارتے ہوئے ماتمی انداز میں کہا، ''یزید نے آج کے حسین کو قتل کر دیا'' اور ہمارے گھر میں اس روز کھانا نہیں پکا۔[۲۵]

فرخ سہیل صاحب اپنے سفر نامے میں دیگر ممالک کی سیاست پر تبصرہ کرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان کی سیاست پر بھی بحث کرتے ہیں۔ ترقی پسند نظریات اور ذوالفقار علی بھٹو سے لگاؤ کے اظہار کے لیے سفر نامے میں ماؤ کیپ کا ذکر کرتے ہیں یہ کیپ ترقی پسند نظریات کی عکاسی کرتی ہے، ماؤ کیپ کے استعمال اس بات کو واضح کرتا ہے کہ فرخ سہیل ترقی پسند نظریات کے حامی ہیں۔

لکھتے ہیں:

جلدی سے اٹھا منہ ہاتھ دھویا اور سر پر اپنی پسندیدہ ماؤ کیپ رکھی۔ اب میں سیاح سے زیادہ انقلابی تھا۔ ان دنوں ابھی ہمارے ہاں ترقی پسند سیاسی لوگوں میں کچھ کچھ ماؤ کیپ کا رواج دیکھنے کو ملتا تھا۔ ماؤ کیپ کو عوامی سطح پر متعارف کروانے میں ذوالفقار علی بھٹو شہید کو کریڈٹ جاتا ہے۔ چینی طرز کا سوٹ یا شلوار اور قمیص پتلون کے ساتھ کئی سال ماؤ کیپ استعمال کیا۔ یہاں تو موسم کافی سرد تھا، اس لیے ماؤ کیپ سیاسی مزاحمت اور شناخت کی نشانی کے ساتھ ساتھ موسمی اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے بھی جائز تھی۔[۲۶]

فرخ سہیل گوئندی نے انقلاب ایران کی تاریخ کی وضاحت کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کی سیاست کو بھی اپنا موضوع بنایا اور سیاست میں ہونے والے واقعات اور عالمی سیاست پر بحث کرتے نظر آتے ہیں۔ انقلاب ایران سے قبل ایران میں رضا شاہ پہلوی کی حکومت تھی اور شاہ کی فوج پر امریکہ کی سرپرستی تھی۔ ظالم شاہ کے خلاف نوجوان لڑکے لڑکیوں نے نعرے بلند کیے ہر طرف ''مرگ بر شاہ'' اور ''مرگ بر امریکہ'' کے نعرے گونجنے لگے۔ شاہ ایران کے لیے جگہ تنگ کر دی گئی اور وہ یہاں سے فرار ہو گیا۔ فرخ سہیل لکھتے ہیں۔

تہران کے انقلابی نوجوانوں نے شاہ کے وہاں سے فرار (۱۶ جنوری ۱۹۷۹ء) کے چھبیس روز بعد شاہی محلات پر ہلہ بولا تو وہاں موجود شاہی محافظ یہ سمجھے کہ کمیونسٹوں نے شاہی محل پر حملہ کر دیا۔۔۔انقلاب ایران میں ہراول دستے کا کردار یہی کمیونسٹ، سوشلسٹ اور ترقی پسند لوگ کر رہے تھے۔ لیکن عالمی سیاست کی شطرنج پر دسترس رکھنے والوں کے کھیل کی اس وقت آسانی سے سمجھ آجاتی ہے جب جلاوطن امام خمینی، عراق میں برسوں کی جلاوطنی ختم کر کے مغربی دنیا کے اہم ترین شہر پیرس میں منتقل ہو جاتے ہیں اس کے بعد وہ انقلاب کے ہیرو کے طور پر میڈیا میں ابھر کر سامنے آتے ہیں اور پھر ایران واپس آتے ہیں۔ شاہ کی روانگی اور امام خمینی کی آمد۔"(۲۷)

جنرل کنعان ایورن نے ترکی میں ۱۲ ستمبر ۱۹۸۰ء کو مارشل لگا دیا اور اس کا جواز جنگ اور سلیمان ڈیمرل اور بلند ایجوت کے درمیان سیاسی کشمکش کو قرار دیا۔ مارشل لاء نافذ کرنے کے بعد ترکی کی اعلیٰ سیاسی قیادت کو گرفتار کرنے کے ساتھ ان پر سنگین مقدمات بھی درج کیے گئے۔ آئین کو ختم کر دیا گیا، سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی اور ملک میں سخت گیر آپریشن شروع کر دیا گیا۔ مارشل لاء حکومت نے سیاست اور زندگی کے ہر شعبے میں سخت فوجی آپریشن کرتی رہی۔ بالآخر ۷ اجولائی ۱۹۸۲ء کو حتمی آئین پیش کیا گیا جس کے تحت سلیمان ڈیمرل اور بلند ایجوت پر دس سال تک ہر طرح کی سیاسی پابندیاں عائد کر دی گئی، اس آئین کے تحت نیشنل سیکیورٹی کونسل کے مشاورتی اختیارات کو بڑھا دیا گیا۔ ۱۹۸۰ء میں جب ترکی میں تیسرا مارشل لاء لگایا گیا تو انقرہ میں کردوں کی علاحدگی کے لیے عبداللہ اوجلان نے اپنی تحریک کو تیز کر دیا۔ اس کرد تحریک کو تیز تر اور مضبوط بنانے کے لیے شام نے لبنان میں ان کو تربیت دی اور اس کی سرپرستی سوویت یونین کر رہا تھا۔ سفر نامہ میں فرخ سہیل نے اس سیاسی صورتحال کو تفصیلی بیان کیا ہے۔

جنرل کنعان اور عبداللہ اوجلان کی سیاسی صورتحال پر اس طرح نظر ڈالتے ہیں:

۱۹۷۸ء میں لیجہ (Lice) ترکی کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے قہوہ خانے میں ایک طالب علم رہنما عبداللہ اوجلان نے اپنی جماعت پی کے کے (پارٹیہ کنان کردستان) کی بنیاد رکھی جو بعد میں خطے کی سب سے بڑی مسلح مارکسٹ تحریک بن کر سامنے آئی اور ترکی کے اندر انتہائی طاقتور علیحدگی پسند تحریک۔ مارکسٹ، سٹالنسٹ، لیننسٹ نظریات رکھنے والی اس تنظیم نے ترکی کا سب سے بڑا دہشت گرد گروہ کہا اور مانا جاتا ہے۔ جنرل کنعان ایورن نے فوجی آمریت کے دوران تنگ نظر ترک قوم پرستی کو اپنے اقتدار کے دوام کے لیے استعمال کیا اور اس نے کرد علاقوں میں مقامات پر کرد زبان بولنے اور کرد لباس پہننے پر پابندی لگا دی۔ ایسے میں عبداللہ اوجلان کی "پی کے کے" ایک شدت پسند علیحدگی پسند تنظیم بن کر ابھری جس

نے ترک افواج، جندرما اور ترک پولیس اور سرکاری تنصیبات پر دہشتگردانہ حملوں کا آغاز کر دیا۔ ۱۹۸۱ء کے بعد پی کے کے ترکی کے اس علاقے میں دہشت کا نشان بننا شروع ہوئی جو ایران سرحد سے شروع ہو کر ارضِ روم اور آگے عراق اور شام کی سرحدات تک پھیلا ہوا ہے۔"(۲۸)

جنرل کنعان ایورن ترکی کی فوج کے سپہ سالار تھے انھوں نے ۱۹۸۰ء میں مارشل لاء لگایا اور وزیر اعظم سلیمان ڈیمرل کو تخت سے گرایا اور بلند ایجوت اور سلیمان ڈیمرل پر دس سال کے لیے سیاسی پابندیاں عائد کر دیں۔ سیاست پر پیچ و خم قومی زندگی کو متاثر کرتے رہے، ملکی سطح پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں فرخ سہیل نے دونوں کا سیاسی تقابل کیا ہے:

ایک ڈکٹیٹر نے ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو اپنے ملک میں مارشل لاء مسلط کر کے اسلام کا پرچم بلند کرنے کا اعلان کیا۔ دوسرے ڈکٹیٹر نے ۱۲ ستمبر ۱۹۸۰ء کو مارشل لاء مسلط کر کے اپنے ملک میں سیکولرازم اور ترک قوم پرستی کا پرچم بلند کرنے کا اعلان کیا۔ حکمرانی کی منڈی میں وہی مال دستیاب ہوتا ہے جس کی ڈیمانڈ ہو۔ ادھر میرے وطن میں اسلام اور ادھر ترکی میں سیکولرازم اور نیشنل ازم۔ دونوں نے حکمرانی کا مال ڈیمانڈ کے مطابق بیچا۔ میری معلومات کے مطابق، ۵ جولائی ۱۹۷۷ء والے ڈکٹیٹر نے ۱۲ ستمبر ۱۹۸۰ء والے ڈکٹیٹر سے مشورہ کیا کہ اقتدار کو کیسے دوام دیا جائے تو اس نے کہا:

"ذوالفقار علی بھٹو کو مت چھوڑنا۔"۔۔۔

دونوں عوامی رہنماؤں میں ایک بات مشترک تھی کہ دونوں ترقی پسند اور سیکولر تھے جبکہ ان دونوں ڈکٹیٹروں میں جو چیز بنیادی طور پر مشترک تھی، وہ تھا ان کا "مائی باپ امریکہ"۔۔۔(۲۹)

لیون ٹراٹسکی کا اصل نام لیوڈیوی ڈووچ برانسٹائن تھا۔ وہ انقلاب روس کی اہم شخصیات میں شمار ہوتا ہے اس کے علاوہ ایک انقلابی مفکر اور سوویت یونین کی اشتراکی حکومت کا پہلا وزیر جنگ اور وزیر خارجہ تھا۔ اس نے لیون ٹراٹسکی بطور قلمی نام روس کے عقوبت خانے میں قید کے دوران اختیار کیا۔ ٹراٹسکی نے نوجوانی میں خفیہ مارکسیت پر مبنی سٹڈی اختیار کی اس کے بعد وٹر وفا کی موت پر مظاہرے کیے جس سے اس نے اپنے انقلابی ہونے کا آغاز کیا۔ اس نے اپنی تنظیم قائم کر رکھی تھی جس میں شہر کے مزدوروں کو شامل کرنا تھا لیکن سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر وہ ۱۸۹۸ء میں قید کر دیا گیا اور بعد میں رہا ہو کر وہاں سے فرار ہو گیا اور مختلف ممالک سائبیریا، لندن، روس اور ترکی میں رہنے لگا لیکن اس نے اپنی سیاسی سرگرمیاں اور انقلابی سرکشیوں کو نہیں چھوڑا۔ فرخ سہیل گوئندی

نے اپنے سفر نامے میں جب اس نے ترکی کا سفر اختیار کیا، اتاترک نے اسکو یہاں پناہ دی اور اس پر سیاسی پابندیاں عائد کیں۔ لکھتے ہیں:

> ۱۲ فروری ۱۹۲۹ء کو سٹالن نے ٹراٹسکی کو سوویت یونین سے جلاوطن ہونے پر مجبور کیا اور وہ ترکی میں لیون صدف کے نام سے داخل ہوا۔ ترکی اس وقت اپنے بانی قائد مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک کی قیادت میں نئی ریاست کی تعمیر و ترقی میں آغاز کر رہا تھا اور ترکی میں کمیونسٹ پارٹی اور کمیونسٹوں کی سرگرمیاں ممنوع قرار دے سی گئیں تھیں۔ اتاترک نے لیون ٹراٹسکی کو اپنے ہاں سیاسی پناہ دیتے ہوئے سٹالن حکومت سے کہا:
>
> ''میں ٹراٹسکی کو اس شرط پر ترکی میں پناہ دوں گا کہ سوویت حکومت میرے ملک میں قتل کرنے کے لیے کوئی سازش اور منصوبہ بندی نہیں کرے گی اور نہ ہی لیون ٹراٹسکی ترکی کی سیاست میں مداخلت کرے گا نہ اس کی تحریریں ترکی میں شائع ہوں گی۔''۔۔۔(۳۰)

دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف سیاسی نظام رائج ہیں جن میں جمہوری، سوشلزم اور کمیونزم وغیرہ شامل ہیں۔ کمیونزم ایک ایسا سماجی نظام ہے جس میں ہر فرد اپنی ضرورت اور قابلیت کے مطابق کام کرتا ہے اور اس کے حساب سے دولت حاصل کرتا ہے جبکہ سوشلزم وہ معاشی نظام ہے جس میں دولت کی تقسیم کاوشوں اور شراکت کے مطابق ہوتی ہے۔ کمیونزم کو سوشلزم کی ذیلی شاخ سمجھا جاتا ہے۔ اشتراکیت فرقہ وارانہ ملکیت اور طبقاتی تقسیم کو ختم کرنے پر زور دیتی ہے۔ اس کا نظریہ سیاسی اور معاشی قسم کا ہے، یہ دولت کی تقسیم کی اساس ضرورت کے مطابق قرار دیتے ہیں۔ بلغاریہ کا شمار اشتراکی ممالک میں ہوتا ہے۔ فرخ سہیل گوئندی ایک آزاد خیال اور انقلابی ذہن کے مالک ہیں، انھیں دنیا گھومنے اور وہاں بسنے والے لوگوں کے رہن سہن میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ دنیا کی تاریخ اور سیاست میں بھی دلچسپی ہے اور وہ جن ممالک کا سفر کرتے ہیں وہاں کے سیاسی نظام کا مطالعہ کرتے ہیں اور مشاہدہ کرتے ہیں کہ آیا کیا جو ان ممالک کی تاریخ اور سیاست کے بارے میں بیان کیا گیا ایسا ہی ہے اور دوسرے ملک میں موجودہ سیاسی نظام سے اس ملک کی صورتحال کیسی ہے اور لوگوں کے کیا تاثرات ہیں۔ بلغاریہ جو کہ ایک سوشلسٹ ملک ہے وہاں کے بارے میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ یہاں صرف طالب علم یا جاسوس وغیرہ ہی سفر کر سکتے ہیں لیکن فرخ صاحب کا مقصد دنیا گھومنا اور ان کے بارے میں دلچسپ حقائق جمع کرنا ہے، وہ بلغاریہ کو سرخ جنت قرار دیتے ہیں۔ سوشلسٹ ملک کی تصویر دکھاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہ شہر کا اہم ترین سکوئر ہے ، جہاں سوشلسٹ بلغاریہ کے قومی دنوں کی مرکزی تقریبات ہوتی ہیں۔"لارگو" کے پچھلی طرف میرے دائیں جانب عمارتوں پر اس تقریبات کے حوالے سے ابھی بھی ناقابل یقین حد تک بڑے بورڈ آویزاں تھے۔کارل مارکس، لینن، گیور گی دیمتروف، دہقانوں،مزدوروں ،محنت کشوں، عورتوں اور بچوں کی سرخ رنگ کی تصویریں ان میں دکھائی دی گئی تھیں کیوں کہ کچھ ہی روز پہلے یہاں ایک تقریب اسی سکوئر میں برپا ہوئی تھی اور اسی مقبرے کی بالکنی پہ بلغاریہ کے صدر تودریوکوف نے مسلح افواج کے فوجی دستوں، سکولوں کے بچوں،خواتین اور طلباء سمیت دیگر شہریوں سے سلامی لی تھی۔سوشلسٹ ممالک میں ایسی تقریبات کسی آرٹ مظاہرے سے کم نہیں تھیں۔اس سکوئر پر ٹریفک ممنوع ہے اور بلغاریہ کے سوشلسٹ انقلاب کے دن کے حوالے سے ہی سکوئر کا نام "ستمبر ۹ سکوئر"اور اس شاہراہ کا نام "بلیوارڈژ سکی"(بلیوارڈروس) ہے۔(۳۱)

اس سفر نامے میں فرخ صاحب نے عالمی سیاست کے ساتھ ملکی سیاست کو بھی بیان کیا ہے۔ان کا انداز بیان اتنا دلچسپ ہے کہ قاری نہایت دلچسپی کے ساتھ سفر نامہ پڑھتا جاتا ہے اور وہ ملکی اور بین الاقوامی سیاست سے آشنا ہوتا ہے اور اس کی سوچ کے نئے در وا ہوتے ہیں اور قاری ایک نئے جہاں میں سفر کرتا ہے اور اس کے سامنے نئے حقائق واضح ہوتے ہیں۔

اس سفر نامے میں علمی،ادبی، تہذیبی، معاشرتی، تاریخی، سیاسی، مذہبی اور سماجی حوالے سے معلومات ملتی ہیں۔ سفر نامہ نگار صرف اس خطے کی تاریخی معلومات ہی نہیں دیتا بلکہ اس علاقے کی سیاست، مذہب، تہذیب وغیرہ کو بھی اپنا موضوع بناتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ ان ممالک کی تاریخ، سیاست اور سماج کا تقابل بھی کرتے ہیں جہاں کا انھوں نے سفر کیا۔سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں ہمیں ان تینوں ممالک کی تاریخ کے ساتھ ساتھ سیاست، مذہب، معاشرت، وہاں کے باشندوں کا رہن سہن، بود وباش، ان کی رسوم ورواج وغیرہ کا بڑے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ زاہد حسین میر، ''شبلی کی تصانیف میں سوانحی اور تاریخی عناصر''، مشمولہ مقالہ برائے ایم فل اردو، سینٹرل یونی ورسٹی آف کشمیر، ۲۰۱۹ء۔

۲۔ خورشید انور، قراۃ العین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور (دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۳ء)، ص ۴۷۔

۳۔ فرخ سہیل گوئندی، میں ہوں جہاں گرد (لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۲۱ء)، ص ۴۶۔

۴۔ ایضاً، ص ۸۴۔

۵۔ ایضاً، ص ۸۶۔

۶۔ ایضاً، ص ۹۶۔

۷۔ ایضاً، ص ۱۷۱۔

۸۔ ایضاً، ص ۱۹۰۔

۹۔ ایضاً، ص ۲۵۱۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۲۰۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۳۹۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۵۴۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۴۸۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۷۸۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۵۳۸۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۵۷۱۔

۱۷۔ جمیل جالبی (مؤلف)، انگریزی اردو لغت (طبع اوّل) (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۵۱۱۔

۱۸۔ ڈاکٹر سید انوار الحق حقی، ہاشم قدوانی، جدید سیاسی فکر (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۱ء) ص ۷۔

۱۹۔ مشرف احمد، راجندر سنگھ بیدی کا تنقیدی مطالعہ (کراچی: نفیس اکیڈمی، جنوری ۱۹۸۸ء)، ص ۱۹۵۔

۲۰۔ قمر رئیس، عاشور کاظمی (مرتبین)، ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر، (لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۴ء)، ص ۵۹۔

۲۱۔ فرخ سہیل گوئندی، میں ہوں جہاں گرد، ایضاً، ص ۶۹۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۰۳۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۸۵۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۱۲۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۷۲۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۲۳۸۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۵۱۰۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۵۸۵۔